عصر حاضر میں بین المذاہب عالمی اتحاد، مکالمہ اور مفاہمت کی ضرورت واہمیت

پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلی اچکزئی
صدر شعبہ علوم اسلامیہ، بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ

ABSTRACT

INTERFAITH DIALOG DE

Nowadays, world has become a global village, trade, science, Technology, means of communication and media has converted the world into a village. Throughout the world, followers of different religions are residing. Their numbers vary from place to place. If in one place, the followers of a certain religion are in majority, in other place, they are in minority. Due to the diverse conditions and circumstances prevailing in the world, the religions of the world affect one another. In diverse circumstance and atmosphere, it is the need of hour that there should be dialogue and debate among the followers of different religions to resolve mutual problems and make the earth a peaceful place worth living for all mankind.

Interfaith dialogue is essential for the

promotion of peace and harmony among the followers of various religions of the world. Dialogue should be among the religious and elite class of different religions. The holy Quran teaches us that there are tow kinds of differences amongst the followers of various religions.

One kind of differences is created by the followers of religions by themselves because they do not follow their religion in true spirit. They deviated from the original teachings of their parent religion. Due to their deviation from the original teachings, difference occurred among the followers of various religions. Otherwise all the religions ()f the world hay common Ethical values and trace their origin from one supreme Entity The second kind of differences can be seen in the various forms of practice, and rules which they follow in their life, for example, followers are one religion have different from of worship, while the followers of another religion worship different. Such kind of differences cannot be called as real differences. The holy Quran teaches us that all mankind is equall created by Almighty Allah. All mankind is from one supreme Entity and there should be

unity among them.

Presently, Muslims of the world are facing numerous problems, economically, socially. Politically, morally and educationally, they have lagged for behind from the other communities of the world. They are suspected as anti modernism and deemed as terrorists. In the prevailing situation, atmosphere of suspicion and mistrust, they cannot compete the west. The prevailing circumstances demand that the Muslims should adopt the policy of compromise and. dialogue to other communities of the world. Interfaith dialogue can cause harmony and unity among the followers of different religions. Distrust and misunderstanding which existed among the followers of various religion, can be removed through dialogue. Peace and tranquility can be promoted among the followers of different religion. The policy of dialogue and compromise can make the universe a peaceful a boding place for all mankind irrespective of their creed and belief.

عصر حاضر میں دنیا ایک گلوبل ویلیج کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، تجارت، سائنس وٹیکنالوجی، ذرائع آمد ورفت اور میڈیا نے دنیا کو ایک گاؤں کی شکل دی ہے، دنیا کے ہر ملک اور ہر شہر میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہائش پذیر ہیں، کہیں مذہب والے اکثریت میں اقلیت میں اور کہیں اس کے برعکس اس لحاظ سے ایک جگہ کے حالات اور معاملات دوسری جگہ اثر انداز ہوتے ہیں، لہذا ان حالات

میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کا ایک دوسرے کے ساتھ مفاہمت، ڈائیلاگ اور مکالمہ وقت کی اہم ضرورت ہے، تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنے متعلقہ مسائل مکالمے اور گفت وشنید کے ذریعے حل کرسکیں۔

مشترکہ تہذیبی وثقافتی قدریں:

اگر ہم دنیا میں موجود بڑے بڑے مذاہب کا معروضی مطالعہ کریں اور پہلے سے سوچے ہوئے فلسفوں اور نظریات سے اور اپنے محبوب اور پسندیدہ رجحانات سے بلند ہوکر صرف اس مقصد سے ان پر نظر ڈالیں کہ ان کے درمیان کیا باتیں واقعۃً مشترک ہیں، تو پہلی بات ہمیں یہ نظر آئے گی کہ ہمارے سارے مذاہب انسانی زندگی کی چند عام اور بنیادی قدروں پر متفق ہیں۔ سچائی، انصاف، عہد کو پورا کرنا، امانت کو ادا کرنا، سب تعریف کا مستحق سمجھتے ہیں۔ جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور خیانت کو سب برا کہتے ہیں۔ ہمدردی، رحم، فیاضی اور فراخدلی کی سب قدر کرتے ہیں۔ خودغرضی، سنگ دلی، بخل اور تنگ نظری کو سب حقیر سمجھتے ہیں۔ صبر وتحمل، ضبط نفس، نرمی اور شائستگی سب کے نزدیک خوبیاں ہیں۔ چھچھورا پن، بندگی نفس، درشتی اور کج خلقی سب کے ہاں برائیاں شمار ہوتی ہیں۔ فرض شناسی، وفاشعاری، مستعدی اور احساس ذمہ داری، کی سب عزت کرتے ہیں۔ نافرض شناسی، بے وفائی، کام چوری اور غیر ذمہ داری کو سب بری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اسی طرح سماجی زندگی کے لئے نظم وضبط، ڈسپلن، تعاون، امداد باہمی، آپس کی محبت، خیر خواہی اور اجتماعی انصاف کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ تفرقہ، انتشار، بدنظمی، نااتفاقی، آپس کی بد خواہی، ظلم اور ناہمواری کو سب نقصان دہ اور مہلک مانتے ہیں۔ چوری، زنا، ڈاکہ، جعل سازی، رشوت خوری سبھی کے نزدیک گناہ ہیں۔ بدزبانی، مردم آزاری، غیبت، چغل خوری، حسد، بہتان تراشی اور فساد انگیزی سب کے ہاں گناہ وعیب ہیں۔ والدین کی خدمت، رشتہ داروں کی امداد، پڑوسیوں سے سلوک، دوستوں سے رفاقت، کمزوروں کی حمایت، یتیموں اور بے کسوں کی خبر گیری، مریضوں کی تیمارداری اور مصیبت زدوں کی اعانت کو سب نیکی کے کام سمجھتے ہیں۔ یہ قدریں انسانی زندگی اور انسانی سماج کی عام قدریں ہیں، کسی مذہب کی ان پر اجارہ داری نہیں۔ یہ ہر مذہب کی یکساں میراث ہیں اس کے سلسلے میں کوئی مذہب اپنے اور غیر کی تمیز نہیں کرتا۔ کوئی مذہب یہ نہیں سکھاتا کہ انصاف، خیر خواہی، ہمدردی اور

محبت صرف اپنے مذہب کے لوگوں کے ساتھ برتو اور دوسرے مذہب کے لوگوں کے ساتھ ظلم، بدخواہی، بے رحمی اور دشمنی سے پیش آؤ۔ اپنے ہی لوگوں کی جان، مال، عزت آبرو کی حفاظت کرو، ان ہی کے ساتھ اشتراک وتعاون کا ہاتھ بڑھاؤ اور دوسرے لوگوں کا مال لوٹ لو، ان کو گھر سے بے گھر کرو، ان کی جائیدادیں غصب کرلو، انہیں قتل اور بے عزت کرو، کوئی مذہب اس رویہ کو روا نہیں رکھتا۔ اپنوں اور دوسروں کے ساتھ سلوک میں اگر کسی معنی میں فرق کیا گیا ہے تو صرف اس قدر کہ ہمیں اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر برتاؤ، زیادہ ایثار واحسان کرنا چاہیے، مگر کسی مذہب نے یہ جائز نہیں رکھا ہے کہ اپنوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے لئے دوسروں کا حق مارا جائے اور ان پر ظلم وزیادتی کی جائے۔ دوسرے کے ساتھ برائی میں اپنوں کی بھلائی کی کوئی مذہب تعلیم نہیں دیتا، ان تمام انسانی قدروں میں جو نیکیاں ہیں، سارے مذاہب کے نزدیک وہ انسان کی فضیلت، عظمت اور بزرگی کا معیار ہیں اور ان میں جو برائیاں ہیں، وہ انسان کی ذلت اور پستی کی نشانیاں ہیں۔

بھلائیوں کا کرنا ہر مذہب میں بڑے ثواب کا کام مانا گیا ہے اور برائیوں کا ارتکاب کرنا ہر دھرم میں گناہ کبیرہ تسلیم کیا گیا ہے۔ نجات کے تصور میں مذاہب کے درمیان اختلاف ہے، لیکن اس باب میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نیک کاموں کے انجام دیئے بغیر اور برے کاموں سے دامن بچائے بغیر نجات نصیب نہیں ہوسکتی ہے۔ ہر انسان کی ذاتی زندگی کے سدھار اور سماج کے بناؤ اور تعمیر کی تفصیلات میں مذاہب کے درمیان اختلافات ہیں، مگر جو ذاتی اور سماجی خوبیاں یا خرابیاں اوپر بیان کی گئی ہیں، ان کے سلسلے میں مذاہب کے درمیان ہرگز دو آراء نہیں ہیں۔ افراد انسانی کا تزکیہ ہو یا سماج کی تعمیر، ان خوبیوں کو پیدا کرنا اور ان برائیوں سے بچنا ہر مذہب کے نزدیک ضروری ہیں۔ ہر مذہب کے نزدیک یہ قدریں بنیادی اور اہم ہیں، کوئی ان کو غیر ضروری، غیر اہم اور سطحی نہیں کہتا۔(۱)

انسانی وحدت واخوت:

اسلام نے ہر طرح کی تفریق کے خاتمے کے لئے انسانی وحدت واخوت کا تصور دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سب انسان ایک نسل سے ہیں، پوری انسانیت آدمؑ کی اولاد ہے، رنگ، زبان، نسل، قبیلہ، برادری، ملک وقوم کی فطری تقسیم باہمی تعارف کے لئے ہے، لیکن انہی اختلافات کی وجہ سے تعصب یا تفریق یا امتیاز اور اونچ نیچ پیدا کرنا غلط ہے، کیونکہ اسلام مساوات انسانی اور وحدت انسانی کی بنیاد

پر اپنے تمام معاشرتی تعلقات استوار کرتا ہے، قرآن میں ہے:

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، پھر تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کی شناخت کر سکو'' (۲)

رنگ اور زبان کے متعلق فرمایا کہ

''یہ تفریق کی بنیادیں نہیں، بلکہ خدا کی قدرت کی نشانیاں ہے۔'' (۳)

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا'' (۴)

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

''عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سفید کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے بجز تقویٰ کے'' (۵)

جبکہ متعدد احادیث میں یہ ارشاد موجود ہے:

کونوا عبادا للّٰہ اخوانا (۶)

''اللہ کے بندو بھائی بھائی بن جاؤ''

ایک اور جگہ پوری انسانیت کو عیال اللہ قرار دیا گیا ہے، ارشاد نبوی ہے:

''ساری مخلوق اللہ کی عیال (گویا اس کا کنبہ) ہے، اس لئے اللہ کو زیادہ محبوب اپنی مخلوق میں وہ آدمی ہے جو اللہ کی عیال (یعنی اس کی مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے'' (۷)

بہر حال! اسلام جغرافیائی حدود کی بنیاد پر انسانیت کو مستقل طور پر تقسیم نہیں کرتا، وہ ایک عالمی انسانی برادری قائم کرنا چاہتا ہے، جو ایک قانون کے تابع اور ایک مرکز سے وابستہ ہو اور جس میں انسانوں کو گروہوں میں تقسیم کرنے والی چیز نسل، رنگ، زبان اور وطنی حدود نہ ہوں، بلکہ پوری انسانیت ایک خاندان بن جائے۔

انبیاءؑ کی مشترکہ تعلیمات:

ہر نبیؑ کی دعوت کی دو بنیادیں ہیں، اول عقیدہ، دوم شریعت واخلاق۔ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے تو اس کے مضمون میں آدم علیہ السلام کی بعثت سے خاتم النبیین ﷺ کی بعثت تک کوئی فرق نہیں آیا، اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان، تمام نازیبا صفات سے اس کی تنزیہ اور آخرت، حساب وکتاب، جنت اور جہنم پر ایمان داخل ہیں۔ ہر نبیؑ نے اپنی قوم کو ان باتوں پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے سے پہلے آنے والی نبیؑ کی تصدیق کی اور بعد میں آنے والے نبی کی بعثت کی بشارت دی، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:

الانبیاء اخوۃ لعلات امّھا تھم شتّی ودینھم واحد(۸)

''تمام انبیاء علاتی بھائیوں کی طرح ہیں (جن کا باپ ایک ہے) اور مائیں مختلف ہیں (یعنی مسائل فروع میں اختلاف ہے) اور ان کا دین ایک ہے''

اسی طرح مختلف قوموں کی طرف انبیاءؑ کی بعثت کا سلسلہ متواتر جاری رہا۔ سب نے ایک ہی حقیقت کو واشگاف کیا، جس کی تبلیغ کا انہیں حکم دیا گیا تھا، سب نے لوگوں کو ایک ہی بات کا قائل کرنے کی کوشش کی اور وہ یہ کہ صرف خدائے واحد کے آگے سر تسلیم خم کردیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس بات کو بہت وضاحت سے بیان کیا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ(۹)

''اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمد ﷺ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ''

اس بات کا تصور نہیں کیا جاسکتا کہ عقیدے کے معاملے میں انبیاءؑ صادقین کی دعوتوں میں فرق ہو، اس لئے کہ عقیدے کے امور خبر کی قبیل سے ہیں اور کسی چیز کے بارے میں خبر اگر دو اشخاص

دے رہے ہیں اور دونوں سچے ہیں، تو ان کی باتوں میں فرق نہیں ہوسکتا، اس لئے یہ بات انتہائی نا معقول ہوگی کہ ایک نبی تو لوگوں کے درمیان اس چیز کی تبلیغ کرے کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے، پھر اس کے بعد دوسرا نبی آکر یہ بتائے کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور دونوں اپنی باتوں میں سچے ہوں۔

یہ تو عقیدہ کا معاملہ ہے، رہی شریعت یعنی ایسی قانون سازی جس سے فرد اور معاشرے کی زندگی کی تنظیم کی جاسکے، تو یہ اس سے مختلف ہے۔ دو انبیاءؑ کی شریعتوں میں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ شریعت عقیدے کے برخلاف انشاء کے قبیل سے ہے، اس لئے اس پر وہ اشکال وارد نہیں ہوتا جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا۔ پھر یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ زمانی ارتقاء اور قوموں کا اختلاف شریعت کے ارتقاء اور اختلاف پر اثر انداز ہوتا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ شریعت کی بنیاد ان چیزوں پر ہوتی ہے جن کا انسانوں کے دنیوی اور اخروی مصالح تقاضا کرتے ہیں، اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ گذشتہ انبیاءؑ میں سے ہر ایک کی بعثت ایک مخصوص قوم کی طرف ہوئی تھی، اس لئے اس کے تشریعی احکام تنگ دائرے میں محدود تھے اور انہی معاملات میں تھے جن کا اس قوم کے مخصوص حالات تقاضا کرتے تھے۔ (۱۰) مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کئے گئے تھے، اس وقت بنی اسرائیل کے حالات اس بات کا تقاضا کر رہے تھے کہ ان کی شریعت سخت ہو اور بحیثیت مجموعی رخصتوں کے بجائے عزیمتوں پر مبنی ہو، جیسا کہ توراۃ میں ہے:

> ''اور جو انسان کو مار ڈالے سو مار ڈالا جائے گا، اور کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے سو جیسا کرے گا ویسا ہی پائے گا، توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت'' (۱۱)

پھر جب کچھ عرصہ گزر گیا اور ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں کچھ سہل اور آسانیوں پر مبنی شریعت لے کر آئے، جیسا کہ عہد نامہ جدید میں ہے:

> ''تم نے یہ سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے، اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر

کرو'' (۱۲)

اسی طرح قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول نقل کیا ہے جو انہوں نے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

وَ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ (۱۳)

''اور میں اس تعلیم وہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں اس وقت میرے زمانے میں موجود ہے اور اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کردوں جو تم پر حرام کردی گئی ہیں''

اپنے اس ارشاد کے ذریعے حضرت عیسیٰؑ نے واضح کردیا کہ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں وہ توریت کے بیانات کی تصدیق وتائید کرتے ہیں اور انہی کی طرف دعوت دیتے ہیں، لیکن جہاں تک شریعت اور حلال وحرام کے احکام کا سوال ہے، تو ان میں کچھ تبدیلیاں کرنے اور بعض آسانیاں پیدا کرنے اور ان میں پائی جانے والی شدت کو ختم کرنے کا انہیں حکم دیا گیا ہے۔ (۱۴)

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہوا کہ متعدد آسمانی ادیان نہیں پائے جاتے، بلکہ دین برحق صرف ایک ہی ہے اور اس کا نام اسلام ہے اور یہ وہ طریقہ زندگی ہے جسے لے کر تمام انبیاءؑ ورسل آئے۔ تمام نبیوں اور رسولوں نے اسی طریقہ زندگی کی طرف لوگوں کو دعوت دی اور یہی وہ دین ہے جو اللہ کے نزدیک ازل سے محبوب اور مطلوب ہے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: ''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے'' (۱۵)۔ ایک دوسری آیت میں ہے ''اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے، اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا'' (۱۶) یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاءؑ ورسلؑ نے اسی دین اسلام کی طرف دعوت دی۔ نوحؑ نے اپنی قوم کو مخاطب کیا اور ارشاد فرمایا: ''اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں خود مسلم بن کر رہوں'' (۱۷) ابراہیمؑ نے بھی یہی فرمایا: ''اس کا یہ حال تھا کہ جب اس کے رب نے کہا کہ مسلم ہوجاؤ! تو اس نے فوراً کہا مالک کائنات میں مسلم ہوگیا'' (۱۸) اور اسی دین اسلام پر چلنے کی ہدایت حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو بھی کی تھی۔ ارشاد خداوندی ہے:

''اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوبؑ اپنی اولاد کو کر گیا تھا، اس نے کہا تھا کہ میرے بچو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا

ہے، لہذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا'' (۱۹) سلیمانؑ نے ملکہ سبا بلقیس کے پاس بھی اسی اسلام کا پیغام دے کر بھیجا تھا، ''میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ'' (۲۰)

حضور ﷺ نے بھی اسی دین اسلام کی دعوت دی، اسی طریقہ زندگی کی طرف لوگوں کو بلایا، یہ الگ بات ہے کہ خاتم الانبیاءؑ ہونے کی حیثیت سے ان کا لایا ہوا دین ایک مکمل دین ہے۔ حضور ﷺ کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے تھے، انہوں نے بھی اسی دین کی دعوت دی، جس کی دعوت تمام انبیاء ورسل نے دی تھی، البتہ خاتم الانبیاءؑ ہونے کی حیثیت سے ان کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ پچھلی شریعتوں میں جو کمی رہ گئی تھی، اسے دور کر کے دین کو مکمل کر دیں۔ لوگوں نے جو تحریفات کر دی تھیں، ان کی تصحیح کریں اور ایک مخصوص انسانی طبقے کے بجائے تمام عالم کو اس دین کی دعوت دیں، یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ پچھلی شریعتوں اور شریعت محمدیہ ﷺ کے مابین بعض فروعی مسائل میں واضح فرق ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلی شریعتیں اپنے وقت اور حالات وضروریات کے مطابق تھیں، جبکہ شریعت محمدیہ رہتی دنیا تک کے حالات وضروریات کے عین مطابق ہے۔ (۲۱)

شرائع کے اختلاف کا تصور:

ایک عمومی غلط فہمی یہ ہے کہ تمام انبیاء کرامؑ کی شریعتوں کو ایک دوسرے سے بالکل الگ، مختلف اور لاتعلق مان لیا گیا ہے، یہ تصور دین کی وحدت اور اسلام کی آفاقیت کے سراسر منافی ہے۔ دین وشریعت میں اختلاف بھی ہے اور بعض احکام وقوانین، اصول وضوابط اور قواعد وآئین کا فرق بھی پایا جاتا ہے، لیکن یہ اختلاف وفرق تضاد وتصادم نہیں ہے۔

ملت ابراہیمیؑ کی اتباع کی ہدایت ربانی (۲۲) سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ آپؑ کے دین وشریعت اور مذہب وطریقت اور تہذیب وتمدن میں پیش روؤں سے کوئی جوہری فرق نہیں پایا جاتا۔ جس طرح دینی عقائد میں اشتراک نظر آتا ہے، اسی طرح گذشتہ انبیاء کرامؑ کے ارکان دین میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے اور اس کو جوہری اتحاد ویگانگت کہا جاسکتا ہے۔ شریعت وقانون میں بعض زمانے کے فرق واختلاف کو اتنا نہیں بڑھایا جاسکتا کہ وہ بالکل دوسری اور منافی شریعت بن جائے، گذشتہ انبیاء کرامؑ کی شریعت سے بھی شریعت محمدیؐ نے بہت کچھ اخذ واکتساب کیا تھا، متعدد شرعی قوانین تمام شرائع انبیا کرامؑ میں نہ صرف یکساں ہیں بلکہ متحد وہم آہنگ بھی ہیں۔ اختلاف وفرق تو زمانوں کے

مختلف تقاضوں کے سبب ہوتا رہا، اسی طرح انسانی تہذیب وتمدن بھی مختلف ادوار میں پروان چڑھتی رہی اور اپنے اپنے عصری تقاضوں کے تحت نشو ونما پاتی رہی، لھذا اس کے مختلف مظاہر میں بھی اشتراک واتحاد، یگانگت ومماثلت اور تعلق ورشتہ پایا جاتا ہے اور عصری تقاضوں، قوموں کے مذاق، زمانے کے حالات، جغرافیائی عناصر کی کارفرمائی، انسانی ذہن کی بوقلمی اور ان سے زیادہ الٰہی رنگ آمیزی نے ان میں رنگارنگی بھی پیدا کی، یہ تہذیب وتمدن دراصل تمام انسانی معاشروں کا بنایا ہوا عطیہ ہے۔(۲۳)

قرآن مجید نے اصلاً اور رسول کریم ﷺ نے عملاً دین ابراہیمیؑ کی طرف اس لئے دعوت دی تھی کیونکہ یہ تمام بڑی مذہبی قوموں کا متفقہ دین اور بنیادی سرچشمہ تھا۔ خاص خاص نام رکھنے والے ادیان اسی کی شاخیں تھیں۔ قرآن مجید کی دعوت اور رسول کریم ﷺ کی تبلیغ میں تمام مذہبی اقوام اور ملتوں کو ان کے اپنے اصلی دین کی طرف پلٹ آنے کی پکار موجود تھی اور وہ ان کے دینی شعور، مذہبی فکر، ملی ادراک اور فطری ساخت سے پوری ہم آہنگ اور ہم آمیز تھی۔ اسی ''کلمہ واحدۃ''(۲۴) کی طرف بلانے میں بڑی حکمت پوشیدہ تھی کہ پیغام محمدیؐ اور دین محمدی ﷺ کچھ اور نہیں، بلکہ وہ سب کا اپنا اصلی دین ہے۔(۲۵)

حضرت شاہ ولی اللہ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں جب کسی رسول کو مبعوث کیا جاتا ہے، تو اس کی ملت کے اصول مسلّم اور اس کی سنتیں مقرر ہوتی ہیں، لہذا نبی مبعوث کی قوم میں اگر کوئی صحیح سنت باقی ہوتی ہے، تو اس کو بدلنے یا تبدیل کرنے کے کوئی معنی نہیں، بلکہ واجب یہ ہوجاتا ہے کہ اس کو باقی ومقرر رکھا جائے، کیونکہ وہ ان کے نفوس سے میل کھاتی ہیں اور ان کے خلاف حجت قائم کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔(۲۶) شاہ ولی اللہ نے بڑی تفصیل کے ساتھ دین ابراہیمیؑ کے بہت سے عقائد، احکام، اعمال ورسوم پر مشرکین عرب کے عقیدے وعمل کا اثبات کیا ہے،(۲۷) لیکن طوالت سے بچنے کی خاطر یہاں پر صرف ایسی چند معاشرتی رسوم کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو دین ابراہیمیؑ کی خصوصیات تھیں اور جن پر مشرکین عرب عمل پیرا تھے، مثلاً: جاہلی عرب میں معاشرتی معاملات کے نہایت مستحکم طریقے متعین تھے اور ان کے ترک کرنے پر ملامت کرتی تھی، ان میں کھانے پینے، لباس، دعوتوں میں، میلوں میں، مُردوں کے دفن کرنے، نکاح، طلاق، عدت، ماتم، خرید وفروخت اور دیگر معاملات سے متعلق روایات شامل تھیں، اسی طرح محارم مثلاً بیٹیاں، مائیں، ہمشیرہ وغیرہ سب ان کے ہاں حرام تھیں۔ ظلم وتعدی کے لئے ان کے ہاں تعزیرات متعین تھیں۔ قصاص، دیت، قسامہ سے وہ سزا

دیتے تھے، زنا، چوری کی بھی سزائیں مقرر تھیں۔(۲۸)

بہر حال! اسلام ابتدائے آفرینش سے ہے، جب سے ہی اس کے قوانین وشریعت واصول ہیں۔ سب سے پہلے پیغمبر ابوالبشر آدمؑ تھے، جب آدمؑ دنیا میں آئے ان پر احکام الٰہی بذریعہ الہام نازل ہوئے، انہیں احکام کے موافق عمل درآمد ہوتا تھا، حسب ضرورت انہیں اصول کی تجدید کے لئے انبیاءؑ مبعوث ہوتے رہے، انبیاءؑ مذہب کا کوئی اصول ایک دوسرے سے مختلف نہیں لائے، اصول ملت سب ایک ہی تھے۔ فروعات میں کسی قدر اختلاف ہوتا تھا اور یہ اختلاف اسباب اور مصلحتوں کی وجہ سے ہوتا تھا، کیونکہ شرائع میں احکام کی مقداریں مقرر کرنے میں مکلفین کے حالات وعادات کا لحاظ رکھا گیا ہے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زنا کی سزا سنگسار تھی، ہماری شریعت میں بعض صورتوں میں سزائے تازیانہ بھی ہے۔ شریعت موسویؑ میں صرف قصاص تھا، ہماری شریعت میں دیت بھی ہے۔ اسلام وہی اسلام ہے جو آدمؑ کا تھا۔ اصول دین وہی اصول دین ہیں جو ازل میں خداوند ذوالجلال نے مقرر فرمائے تھے، چنانچہ خداوند کریم خود قرآن مجید میں اہل عرب کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں: مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (۲۹) درحقیقت مذہب اسلام ملت ابراہیمی کا اتباع ہے۔ اہل عرب ہمیشہ ابراہیمؑ کو اپنا جد وپیشوا سمجھتے رہے، بیت اللہ کی وجہ سے تمام عرب میں شریعت ابراہیمیؑ رائج تھی، جب ادیان میں تحریف ہوئی اور بت پرستی وغیرہ شائع ہوئی، تو مراسم شریعت میں بھی تغیر وتبدل ہوا، لیکن اصل سب کی وہی شریعت ابراہیمی تھی، اس لئے اکثر مراسم میں باوجود تحریف، قریب قریب اصل حقیقت کی جھلک باقی تھی۔

عرب میں جو یہود ونصاریٰ تھے، یا آکر آباد ہوگئے تھے، وہ بھی انہیں مراسم ورواج کے پابند تھے، جب رسول کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے، بلکہ اسی اصل اور سچے دین کو قائم کرنے آئے جو آدمؑ وابراہیمؑ کا تھا، اس لئے حضور ﷺ نے وہ باتیں جو شریعت سابقہ کے موافق تھیں برقرار رکھیں، جن میں کچھ تغیر ہوا تھا ان کی اصلاح کردی اور جو ادیان سابقہ کے بالکل خلاف تھیں، ان کو مسترد کردیا، اس لئے شریعت اسلامیہ میں بعض وہ باتیں موجود ہیں جو زمانہ جاہلیت میں بھی جاری تھیں۔ طلاق، مہر، اجارہ، وصیت، بیع اور تقسیم ترکہ ونکاح کے لئے عہد جاہلیت میں متعدد ضوابط تھے۔ نکاح میں ولی کی ضرورت ہوتی تھی، مہر مقرر ہوتا تھا۔ ماں، بہن، بیٹی، دادی، پوتی، پھوپھی اور بھتیجی سے نکاح حرام تھا۔ رسول کریم ﷺ نے ان کو مناسب اصلاح کے ساتھ قائم رکھا ان کے علاوہ

اور بھی رشتے حرام قرار دئے۔ بیع کی بہت سی صورتیں تھیں، مثلاً بیع سلم، بیع مرابحہ اور بیع مساومہ وغیرہ، آپؐ نے ان میں بعض کو قائم رکھا، بعض میں اصلاح کردی اور بعض کو منسوخ کیا۔ شمس الدین احمد بن قودر نے لکھا ہے کہ مضاربت جائز ہے، کیونکہ یہ عمل کرتے ہوئے لوگوں کو پیغمبر ﷺ نے دیکھا اور اس کی توثیق فرمائی (۳۰)

غرض زمانہ جاہلیت میں عرب میں ہر قسم کے رسم ورواج تھے اور ان کے قواعد مقرر تھے اور یہ تمام مراسم ورواج شریعت ابراہیمیؑ کی محرف صورتیں تھیں۔ بہر حال چاہے عرب کے قوانین ہوں، یہود ونصاریٰ کے مذہبی قواعد ہوں، رومن لاء ہو یا دھرم شاستر سے ماخوذ رسم ورواج ہوں، ان میں ایک قسم کی مماثلت پائی جاتی ہے اور مماثلت کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی تمام شریعتیں اور تمام قوانین شرائع انبیاءؑ سے ماخوذ ہیں، کیونکہ شرائع انبیاءؑ سب سے اوّل ہیں، پھر جس کسی نے قانون بنایا، انہیں دیکھ کر بنایا اور انہیں میں اپنی خواہش ومرضی کے مطابق ترمیم وتنسیخ کردی۔ (۳۱) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر ﷺ کو بھیجا، جنہوں نے اصل دین اسلام لوگوں کے سامنے پیش کیا جس کے قوانین فقہ اسلامی کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں اور فقہ اسلامی وہ قانون ہے جو ہر زمانہ، ہر حالت، ہر ملک اور ہر قوم کے مناسب حال ہے اور اس کے تمام ضوابط موافق عقل وانصاف ہیں۔

بین التہذیبی تقارب کی اہم بنیاد:

قرآن حکیم نے بار بار صاف اور قطعی لفظوں میں اس حقیقت کا اعلان کردیا ہے کہ وہ کسی نئی مذہبی گروہ بندی کی دعوت لے کر نہیں آیا ہے بلکہ چاہتا ہے کہ تمام مذہبی گروہ بندیوں کی جنگ ونزاع سے دنیا کو نجات دلادے اور سب کو اسی ایک راہ پر جمع کردے جو سب کی مشترکہ اور متفقہ راہ ہے، اسی مشترکہ اور متفقہ راہ کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی نے درج ذیل آیت میں اس طرح دی ہے!

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳۲)

"کہو! اے اہل کتاب: ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے

ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور اللہ کو چھوڑ کر ہم ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنا لیں"

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کو توحید کی دعوت دی اور فرمایا کہ ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے نزدیک مسلم ہے، ہم بھی مانتے ہیں تم بھی مانتے ہو اور وہ یہ کہ ہم سب صرف اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں۔ یہود و نصاریٰ کو معلوم تھا کہ ہمارے دین کی اصل تعلیم یہی ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ کریں، اگرچہ انہوں نے شرک کو اختیار کر لیا تھا، لیکن ان کے دین میں جو صحیح بات تھی وہ ان کو معلوم تھی، اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ ان کو توحید کی طرف بلاؤ اور انہیں بتاؤ کہ یہ وہ چیز ہے جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، اس کو قبول کرو۔ (۳۳)

اس سے معلوم ہوا کہ حضور سراپا نور ﷺ کوئی نئی دعوت، کوئی نرالا دین لے کر نہیں آئے تھے بلکہ حضور ﷺ بھی اس توحید کے داعی بن کر تشریف لائے تھے جس کی دعوت ہر نبی نے دی، نیز اس آیت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ انسانیت جو آج مختلف اور گروہوں میں بٹ کر رہ گئی ہے، جس کے باعث گلشن ہستی جہنم زار بن گیا ہے، اس کے اتحاد کی حقیقی اور محکم بنیاد عقیدہ توحید ہی ہے، جو دنیا کی ساری حقیقتوں سے واضح تر اور روشن تر حقیقت ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس پلیٹ فارم پر جمع ہونے کے لئے اہل کتاب کو دعوت دی۔ (۳۴)

ماقبل کی شریعت بحیثیت مآخذ فقہ:

فقہاء کرام کا اس بارے میں متفقہ فیصلہ ہے کہ گذشتہ شریعتوں کے بعض ایسے احکام جنہیں ہماری شریعت نے برقرار رکھا ہے، ہم بھی ان کے پابند ہیں، جیسا کہ ابن العربی اور ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں:

الصحيح القول بلزوم شرع من قبلنا لنا مما اخبرنا به نبينا ﷺ عنهم (۳۵) اوقصه الله علينا من غير نكير (۳۶)

"صحیح قول یہی ہے کہ انبیاء سابقین کی شریعت کے احکام کی پیروی ہم پر لازم ہے، بشرطیکہ ان کو ہمارے نبی ﷺ نے نقل فرمایا ہو، یا انہیں حق تعالیٰ نے

بغیر کسی نکیر کے بیان کر دیا ہو"

اسی طرح جمہور فقہاء کے نزدیک گذشتہ شریعتوں کے وہ احکام جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کئے ہیں، یا وہ سنت نبوی ﷺ میں مذکور ہیں، مگر ہماری شریعت اس کے بارے میں خاموش ہے، اس میں نہ تو اس کی تاکید گئی ہے اور نہ اسے منسوخ کیا گیا ہے، تو ایسے احکام بھی ہمارے لئے قابل عمل ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں گذشتہ انبیاءؑ اور ان کی شریعتوں کے تذکرہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا ہے:

"یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت کی ہے، سو تو چل ان کے طریقے پر" (۳۷)

اس آیت کی تفسیر میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں کہ تمام انبیاء گذشتہ فروعی احکام کے بھی پابند تھے، بشرطیکہ جدید شریعت میں ان کو منسوخ نہ کر دیا ہو، پس گذشتہ شریعتوں کے فروعی احکام کی تعمیل بھی ہم پر واجب ہے، اگر ہماری شریعت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو منسوخ نہ کر دیا ہو۔ (۳۸)

ثقافتی وتہذیبی تقارب، عصر حاضر کی ضرورت:

غزوہ احزاب میں مسلمانوں نے جو جنگی تدابیر اختیار کیں، ان میں سے ایک خندق کی کھدائی ہے، حالانکہ خندق کھودنا عرب کا طریقہ نہ تھا، بلکہ شاہان فارس کا طریقہ تھا۔ اس کا مشورہ حضرت سلمان فارسیؓ نے دیا تھا اور تمام مسلمانوں نے اس جنگی تدبیر کو پسند فرمایا تھا، (۳۹) اس سے معلوم ہوا کہ جہاد میں کفار کے طریقہ جنگ کو اختیار کرنا درست ہے اور علی ہذا کفار کے ایجاد کردہ آلات حرب کا استعمال بھی درست ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ طائف میں منجنیق کا استعمال فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محاصرہ تستر میں ابوموسیٰ اشعریؓ کو منجنیق قائم کرنے کا حکم دیا اور عمرو بن العاصؓ نے جب اسکندریہ کا محاصرہ کیا تو منجنیق کا استعمال کیا اور علی ہذا زہر آلود تیر کا استعمال بھی درست ہے۔ معلوم ہوا کہ ان تمام چیزوں کا سیکھنا ضروری ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ کے دشمن مرعوب اور اللہ کے دین کی عزت اور شوکت قائم ہو۔ کتاب وسنت اور شریعت، کسی صنعتی اور حرفتی ترقی سے منع نہیں کرتی، بلکہ ہر اس صنعت اور حرفت کو جس سے ملک کو ترقی ہو، فرض علی الکفایہ قرار دیتی ہے، جیسا کہ تمام فقہاء کرام کا اجماع ہے، البتہ شریعت اسلامیہ یورپ کی بے حیائی اور بے شرمی اور شہوانی اور نفسانی تہذیب کی

شدید مخالف ہے، اس لئے کہ شہوانی اور نفسانی امور میں آزادی اخلاق اور معاشرہ کو تباہ اور برباد کرتی ہے جو ملکی تنزلی کا باعث ہے۔ (۴۰)

غزوہ خندق کا واقعہ نقل کرنے کے بعد محمد سعید رمضان البوطی لکھتے ہیں:

''یہ ان بہت سی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حکمت مؤمن کی گمشدہ متاع ہے، وہ جہاں بھی اسے پاتا ہے، اختیار کر لیتا ہے (۴۱) بلکہ دوسروں کے مقابلے میں اس کا زیادہ مستحق ہے، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی شریعت جتنا اس چیز کو ناپسند کرتی ہے کہ مسلمان بغیر سمجھے بوجھے دوسروں کی پیروی اور تقلید کریں، اتنا ہی وہ یہ جانتی ہے کہ مسلمانوں کو جہاں بھی کوئی چیز نظر آئے اور جہاں بھی وہ اسے پائیں اختیار کر لیں اور تمام مفید اصولوں کو اپنا لیں۔ اس سلسلے میں عام اسلامی قاعدہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے طرز عمل اور عام احوال و معاملات میں اپنی آزاد عقل اور دقیق فکر کو معطل نہ کرے۔ اس صورت میں وہ نہ اپنی تکمیل دوسروں کے ہاتھ میں تھما سکتا ہے کہ وہ اس کو بغیر کسی شعور اور بصیرت کے جہاں چاہیں لے جائیں اور نہ کسی ایسے اصول عمل یا نظام کو نظر انداز کر سکتا ہے، جس کے ذریعے اس کی روشن عقل اور آزاد فکر محفوظ رہے اور جو شریعت اسلامی کے اصولوں سے ہم آہنگ ہو۔ (۴۲)

اس سلسلے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ''مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کش مکش'' میں ایک طویل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک مغربی تہذیب جسے انہوں نے ملی جلی تہذیب کا نام دیا ہے، اس تہذیب کو اپنانے یا مسترد کرنے کے بارے میں تین موقف ہو سکتے ہیں، پہلا موقف یہ ہے کہ عالم اسلام اس تہذیب کے سارے نتائج اور فوائد کا یکسر انکار کر دے، دوسرا موقف یہ ہے کہ اس تہذیب کو جوں کا توں قبول کر لے اور تیسرا موقف جسے انہوں نے متوازن اور صحیح موقف قرار دیا ہے، یہ ہے کہ اس تہذیب کی ضروری چیزوں کو قبول کرنا چاہیے، بشرطیکہ اس سے مسلمانوں کی اپنی تہذیب متاثر نہ ہوتی ہو اور غیر ضروری چیزوں کو یا ان اشیاء کو جن کے اختیار کرنے سے مسلمانوں کی اپنی تہذیب پر حرف آتا ہو، مسترد کرنا چاہیے۔ پہلے موقف کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''پہلا موقف یا رویہ منفی اور سلبی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم اسلام اس تہذیب کے سارے نتائج اور فوائد کا یکسر انکار کر دے اور اس کی کوئی اچھی

بری بات سننے کا روادار نہ ہو، یا غیر جانبداری اختیار کر کے کنارہ کش ہو جائے، نہ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھائے، نہ ان علوم کو ہاتھ لگانے پر تیار ہو جن میں اہل مغرب کو تفوق و امتیاز حاصل ہے، طبعیات، ریاضیات اور ٹیکنالوجی جیسے علوم میں بھی وہ مغرب سے استفادہ علمی کو حرام اور اپنے لئے ''شجرہ ممنوعہ'' سمجھے اور جدید آلات، مشینیں، ساز وسامان اور ضروریات زندگی کے قبول کرنے سے بھی گریز کرے۔ اس موقف کا قدرتی نتیجہ عالم اسلام کی پسماندگی اور زندگی کے رواں دواں قافلہ سے بچھڑنے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس سے عالم اسلام کا رشتہ باقی دنیا سے منقطع ہو جائے گا.....ان سب حقائق کے علاوہ یہ رویہ کوتاہ نظری پر مبنی ہے، اس سے فطری قوتوں اور وسائل میں تعطل پیدا ہوتا ہے اور یہ اس دین فطرت کی صحیح ترجمانی اور تعبیر نہیں ہے، جس نے کائنات میں عقل وتدبر کے استعمال پر بڑا زور دیا ہے اور مفید علوم میں استفادہ کی ترغیب دی ہے، جس نے دین کی حفاظت ودماغ کے لئے اور بد اندیشوں اور حریفوں کو اپنے اوپر حملہ کرنے سے محتاط رکھنے کے لئے ہر ممکن تیاری کا حکم دیا ہے''۔(۴۳)

دوسرے موقف یعنی مغربی تہذیب کی مکمل پیروی کو رد کرتے ہوئے وہ اس کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اجتماع ومعاشرت اور سوشل زندگی میں مغربی طریقوں کی پیروی اور ان کے اصول زندگی اور طرز معاشرت کو قبول کر لینا اسلامی معاشرہ میں بڑے دور رس نتائج رکھتا ہے، اس وقت مغرب ایک اخلاقی جذام میں مبتلا ہے، جس سے اس کا جسم برابر کٹتا اور گلتا چلا جارہا ہے اور اب اس کی عفونت (بدبو) پورے ماحول میں پھیلی ہوئی ہے، اس مرض جذام کا سبب اس کی جنسی بے راہ روی اور اخلاقی انارکی ہے جو بہیمیت وحیوانیت کے حدود تک پہنچ گئی ہے.....ان اسلامی ملکوں میں جہاں مغربی تہذیب کی پرجوش نقل کی جارہی ہے.....وہاں اس جذام کے آثار وعلامات پوری طرح ظاہر ہونے لگی ہیں اور یہ قانون

قدرت ہے جس سے کہیں مفر نہیں۔" (۴۴)

تیسرے موقف کے سلسلے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے محمد اسد کی کتاب "طوفان سے ساحل تک" سے ایک اقتباس پیش کیا ہے جس سے اس شاہراہ کی نشان دہی ہوتی ہے، جس پر عالم اسلام کو مغرب سے استفادہ اور جدید وسائل سے کام لے کے میدان میں چلنا چاہیے، محمد اسد لکھتے ہیں:

"علم مغربی ہے نہ مشرقی، علمی انکشافات وتحقیقات ایک ایسے سلسلے کی کڑی ہیں جن کی کوئی انتہاء نہیں اور جس میں تمام بنی نوع انسان برابر کے شریک ہیں۔ ہر عالم اور سائنٹسٹ ان ہی بنیادوں پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھتا ہے جو اس کے پیش روؤں نے قائم کی تھیں، خواہ وہ اس کی قوم سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی اور قوم سے، اسی طرح ایک انسان سے دوسرے انسان، ایک نسل سے دوسری نسل، ایک تہذیب سے دوسری تہذیب تک تعمیر و اصلاح وترقی کا کام برابر جاری رہتا ہے، اس لئے اگر کسی خاص زمانہ یا خاص تمدن میں یہ کام انجام پائیں، تو یہ قطعاً نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس زمانہ یا اس تہذیب کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی اور زمانہ میں کوئی دوسری قوم جو زیادہ باہمت اور حوصلہ مند ہو، میدان علم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے، لیکن بہر حال سب اس کام میں برابر کے حصہ دار ہیں .....اگر مسلمان (جیسا کہ ان پر واجب ہے) صنعتی علوم وفنون کے نئے ذرائع اپناتے ہیں تو وہ ایسا صرف ارتقاء وترقی کی فطری خواہش اور جذبہ سے کرتے ہیں، دوسروں کے تجربات اور معلومات سے فائدہ اٹھانے کی فطری خواہش اور جذبہ، لیکن اگر وہ (اور ان کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہے) مغربی زندگی کی اشکال، آداب، عادات اور مغرب کے اجتماعی تصورات کو اپناتے ہیں تو اس سے ان کو ذرہ برابر بھی فائدہ نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ یورپ ان کو اس میدان میں جو دے سکے گا، وہ اس سے بہتر نہیں ہوگا، جو خود ان کی ثقافت اور ان کے دین نے ان کو عطا کیا ہے۔ اگر مسلمان ذرا ہمت بلند کریں اور حوصلہ سے کام لیں اور ترقی کو ایک وسیلہ کی حیثیت سے اپنائیں تو وہ اس طرح نہ صرف اپنی باطنی حریت کی حفاظت کر

سکیں گے، بلکہ شاید یورپ کے انسان کو زندگی کے گمشدہ لطف کا راستہ بھی بتا سکیں گے''(۴۵)

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''مغرب سے علم وصنعت، ٹیکنالوجی اور سائنس اور ان علوم وتحقیقات میں جن کا تعلق تجربہ، حقائق وواقعات اور انسانی محنت وکاوش سے ہے، فراخ دلی کے ساتھ استفادہ کیا جائے، پھر ان کو ان مقاصد کے لئے اپنی خداداد ذہانت اور اجتہاد کے ساتھ ان اعلیٰ مقاصد کا تابع اور خادم بنایا جائے، جو آخری صحیفہ نے ان کو عطا کئے اور جن کی وجہ سے ان کو خیر امت اور آخری امت کا لقب ملا ہے، وسائل اور مقاصد کا یہ خوشگوار امتزاج.....دنیا کی قسمت بدل سکتا ہے اور اس کو خودکشی وخودسوزی کے راستے سے ہٹا کر فلاح دارین اور سعادت ابدی کے راستہ پر ڈال سکتا ہے.....یہ کارنامہ وہی امت انجام دے سکتی ہے جو آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشین اور اس کی تعلیمات کی حامل وامین ہے۔ (۴۶)''

اہل اسلام اور مغربی تہذیب میں مفاہمت:

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان متعدد بنیادی اختلافات کے باوجود دونوں تہذیبوں میں ایسے عناصر موجود ہیں، جن میں دونوں کے درمیان شراکت اور باہمی احترام کا رشتہ قائم ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اسلام محبت، اخوت، رواداری، شائستگی، اچھی ہمسائیگی اور امن عالم کا علم بردار ہے۔ پیغمبر ﷺ نے بعثت سے قبل مکہ میں ایک ایسے ہی معاہدہ امن یعنی حلف الفضول میں شرکت کی تھی اور بعثت کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں آج بھی ایسے کسی معاہدے میں شرکت کرنا پسند کروں گا(۴۷) چنانچہ مسلمانوں نے کبھی ایسے ڈائیلاگ اور ایسی مفاہمت سے انکار نہیں کیا، نبی کریم ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپؐ نے یہود اور مقامی قبائل سے مل کر ایک امن معاہدہ تیار کیا، اسی طرح صلح حدیبیہ میں بھی آپؐ نے ایک ایسے معاہدہ امن پر دستخط کئے، جسے دیکھ کر بظاہر یوں لگتا تھا کہ گویا مسلمانوں نے دباؤ میں آکر اور اپنی کمزوری تسلیم کر کے معاہدہ امن کیا ہے۔(۴۸)

دعوت وجہاد میں بھی آپ کا اسوہ مبارکہ یہی تھا کہ اگر فریق مخالف اسلام کی دعوت قبول کرلے یا کم از کم اسلام کی برتری تسلیم کرلے، تو اس کے ساتھ مفاہمت کا راستہ اپنایا جائے گا، (۴۹) نبی کریم ﷺ کے اس اسوہ حسنہ کا یہ اثر تھا کہ خوارج سے شدید ترین اختلاف کے باوجود حضرت علیؓ نے ان کے خلاف ایکشن لینے سے انکار کردیا اور ان سے فرمایا کہ "ہم تمہارے ساتھ اس وقت تک نہ لڑیں گے جب تک کہ تم ہم سے نہ لڑو"۔ (۵۰)

علاوہ ازیں اسلام حریت فکر کا قائل ہے اور ہر قسم کے جبر کی مذمت کرتا ہے، اس کا بنیادی اصول ہے کہ دین قبول کرنے میں کوئی جبر نہیں (۵۱) جو چاہے حق قبول کرلے، جو چاہے نہ کرے (اگر چہ حق ہی اس کا مستحق ہے کہ اسے قبول کیا جائے) اور دعوت وتبلیغ میں اسلام کا بنیادی اصول یہ ہے وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (۵۲) یعنی ڈائیلاگ اور وہ بھی شائستگی اور متانت کے ساتھ کرنی چاہیے، تاکہ اختلافات کم ہوں اور مفاہمت فروغ پائے۔

میثاق مدینہ، بین المذاہب تقارب کا نمونہ:

نبی کریم ﷺ نے جب مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی، تو یہاں کے رہنے والوں کے لئے دنیا کا سب سے پہلا دستور آپؐ کے ہاتھوں وجود میں آیا۔ اس دستور میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی صراحت تھی کہ غیر مسلموں کو ان کے دین کی پوری آزادی ہوگی، چنانچہ ایک دفعہ کے الفاظ یہ ہیں: للمسلمین دینھم ولليهود دينهم یعنی مسلمانوں کے لئے مسلمانوں کا دین اور یہودیوں کے لئے ان کا دین ہے؛ یعنی وہاں جتنے بھی لوگ بستے تھے، ان کو دینی، عدالتی اور قانونی آزادی کا اطمینان دلایا گیا۔ (۵۳)

اس معاہدے کے متعلق کیرن آرم اسٹرانگ نے لکھا ہے کہ یہ ایک ایسا معاہدہ ترتیب دیا گیا جو خوش قسمتی سے آج تک محفوظ ہے جس کی رو سے مدینے کے مہاجر وانصار، یہود اور مشرک سب ایک امت میں شامل ہوگئے، وہ لکھتی ہے:

> A treaty was drawn up which ,by a stroke of good fortune,has been preservd in the early sources so we see the blue print of the first islamic community .It stated that Muhammad

was entering into a covenent with the Arab and Jewish tribes of Madina(54)

بہر حال اس میثاق کے ذریعے سے آپؐ نے اہلیان مدینہ کو بین المذاہب یگانگت اور اتحاد کا درس دیا اور اس معاہدے سے قیام امن اور انسانی اقدار کے تحفظ میں بھرپور مدد ملی۔

مؤلفۃ القلوب کے بارے میں اسلام کی پالیسی:

اسلام میں ایک مستقل اصول وہ ہے، جس کو قرآن میں تالیف قلب کہا گیا ہے(۵۵) تالیف قلب کا مطلب ہے دلوں کو جوڑنا، لوگوں کو اپنے سے مانوس کرنا، یہ مقصد صرف اس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے کہ دوسروں کی رعایت کی جائے، دوسروں کے جذبات اور مفادات کا احترام کیا جائے، تالیف قلب کا یہ اصول اسلامی دعوت کا ایک اہم اصول ہے۔

نبی کریم ﷺ نے بھی اپنی زندگی میں تالیف قلب کے اس اصول پر عمل فرمایا؛ مثلاً جب حضور اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی، تو بحکم خداوندی آپؐ نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا شروع فرمایا، مفتی محمود رحمہ اللہ کے بقول شاید اس میں یہ حکمت ہو کہ مدینہ منورہ میں اور آس پاس یہود قبائل آباد تھے، جو بیت المقدس کو قبلہ مانتے اور تسلیم کرتے تھے، تاکہ وہ اسلام کی طرف راغب ہوں اور یہ نہ کہہ سکیں کہ مسلمان ہمارے مذہب اور دین کے خلاف ہیں، یہ سلسلہ تقریباً ۱۶ یا ۱۷ ماہ جاری رہا"(۵۶) اسی طرح رمضان کے روزہ کی فرضیت سے پہلے آپ بھی انھی دنوں میں روزہ رکھتے رہے، جن دنوں یہود روزہ رکھتے تھے۔(۵۷)

غزوہ حنین کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے اہل مکہ کو جو فتح مکہ کے موقعے پر مسلمان ہوئے تھے، دوسروں سے زیادہ مال غنیمت عطا فرمایا۔ اس تقسیم میں آپؐ نے جنگ جوؤں کے درمیان حقیقی مساوات کے اصول کی بھی رعایت نہیں فرمائی، آنحضرت ﷺ کا یہ عمل ان اہم دلالتوں میں سے ہے جن سے عام ائمہ اور فقہاء نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ امام جن لوگوں کی تالیف قلب چاہتا ہے، انہیں مصلحت کے مطابق زیادہ عطیات دے سکتا ہے، بلکہ ایسا کرنا وقت مصلحت واجب ہے اور کوئی حرج نہیں کہ یہ عطیات اصل اموال غنیمت میں سے ہوں، اسی لئے زکوٰۃ میں ان لوگوں کا ایک خاص حصہ رکھا گیا ہے، جو حاکم کے پاس جمع ہوتا رہے گا، تاکہ جب بھی ضرورت ہو وہ اس میں سے ان لوگوں کو دیتا رہے، جن کے بارے میں وہ محسوس کرے، ان کی تالیف قلب اسلامی مفاد میں ہے۔(۵۸)

اسلام اور دنیائے مغرب کے مابین مفاہمت کے لئے یہ امر انتہائی ضروری ہے کہ مسلمان مفکرین و مصنفین اہل مغرب کے سامنے اسلام کی تعلیمات کو مؤثر اسلوب اور پیرائے میں پیش کریں اور اس کے لئے عصر حاضر میں پرامن حالات کا قیام اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان اختلاط نہایت ضروری ہے، کیونکہ پرامن حالات اور آپس میں اختلاط ہمیشہ مفاہمت بین المذاہب اور اسلامی دعوت کے لئے انتہائی مددگار ہوتے ہیں، اسلامی تاریخ میں اس کی بہترین مثال صلح حدیبیہ ہے، جس کے بارے میں مشہور تابعی ابن شہاب زہری لکھتے ہیں:

''جنگ میں ایک دوسرے سے ملتے تھے، پھر جب صلح ہوگئی تو جنگ کا خاتمہ ہو گیا اور لوگوں نے ہتھیار رکھ دئے اور لوگ ایک دوسرے سے امن میں ہوگئے، اس کے بعد ایک دوسرے کے درمیان بات چیت ہونے لگی، اب مؤمن اور غیر مؤمن معتدل حالات میں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ پھر جب بھی کوئی شخص اسلام پر بات کرتا تھا تو وہ اس کو سمجھ لیتا اور وہ اسلام میں داخل ہو جاتا، اس طرح دو سال میں اتنے زیادہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے جو اس سے پہلے پوری مدت میں نہیں ہوئے تھے۔''(۵۹)

مولانا حسین احمد مدنی اس صلح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپس میں اختلاط ہونا، نفرت میں کمی آنا، مسلمانوں کے اخلاق اور ان کی تعلیمات کا معائنہ کرنا، دلوں سے ہٹ دھرمی اور ضد کا اٹھ جانا، یہی امور تھے جنہوں نے اکابر قریش کو کھینچ کر صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان بناتے ہوئے مکہ سے مدینہ پہنچا دیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ، عمرو بن العاصؓ وغیرہ اس طرح حلقہ بگوش اسلام بن گئے کہ قریش کی ہستی فنا ہوگئی۔ الغرض اختلاط باعث عدم تنافر ہے اور وہ اقوام کو اسلام کی طرف لانے والا اور تنافر باعث ضد اور ہٹ دھرمی اور عدم اطلاع علی المحاسن ہے اور وہ اسلامی ترقی میں سدراہ ہونے والا اور چونکہ اسلام تبلیغی مذہب ہے، اس لئے اس کا فریضہ ہے کہ جس قدر ہو سکے غیر کو اپنے میں ضم کرے، نہ یہ کہ اس کو دور کرے، اس لئے اگر ہمسایہ قومیں ہم سے نفرت کریں تو ہم کو ان کے ساتھ نفرت نہ کرنا چاہیے۔''(۶۰)

علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے:

''اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے، اب صلح کی وجہ سے آمد ورفت شروع ہوئی، خاندان اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینہ میں آئے، مہینوں قیام کرتے اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے، باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آتا رہتا تھا، اس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حسن عمل، نیکو کاری، پاکیزہ اخلاقی کی ایک زندہ تصویر تھا، جو مسلمان مکہ جاتے تھے ان کی صورتیں یہی مناظر پیش کرتی تھیں، اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھنچے آتے تھے۔''(۶۱)

مختلف تہذیبوں کے درمیان کش مکش یا مفاہمت کے بارے میں پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

''جہاں تک تہذیبوں کے درمیان کش مکش کا سوال ہے، یہ ہمیشہ سے رہی ہے، افکار کے میدان میں مناظرے کا عمل اور مسابقت کی کوشش ایک ابدی حقیقت ہے۔ اقدار کا اختلاف اور موازنہ بھی ازل سے رواں ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ ایک دوسرے کے اوپر اثر انداز ہونے کا یہی وہ تہذیبی طریقہ ہے، جس سے افکار جلا پاتے ہیں، نئے تصورات ابھرتے ہیں اور ترقی کے چشمے پھوٹتے ہیں، تبلیغ، ترقی، دعوت، شہادت حق یہ سب اس کے مختلف پہلو ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ تہذیبوں کے درمیان مقابلہ اور مسابقت کوئی پریشان کن چیز نہیں ہے۔

اسلام میں دعوت دین اس بات کا نام ہے کہ ہم ہر گروہ، ہر فرد، ہر تہذیب، ہر ملک اور ہر قوم تک پہنچیں۔ ان کی بات سنیں اور اپنی بات سنائیں، دلیل سے بات کریں، اپنی دعوت کی صداقت کو ثابت کریں، انہیں اپنے دائرے میں شامل کرنے کی کوشش کریں۔ ''اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو''(۶۲)

تہذیبوں کے درمیان مسابقت اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی کوشش ایک فطری چیز ہے، تاہم یہ فطری چیز اس وقت تشویش کا باعث بنتی ہے، جب دو تہذیبوں یا جن دو قوموں یا جن دو افراد کے درمیان یہ معاملہ ہو رہا ہے، وہ دلیل، حقائق اور مواقع کی یکسانی کی بنیاد پر نہ ہو، بلکہ دوسرے گروہ کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اس پر قوت کے ذریعے سے اثر انداز ہو، یا اسے مغلوب کرنے کے لئے اثر انگیزی کے وہ ذرائع اختیار کرے جو عقلی اور اخلاقی اعتبار سے درست نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے یہ کہہ کر ایسے عمل کا دروازہ بند کر دیا ''کہ دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے'' (۶۳)

تبادلہ خیال اور ڈائیلاگ، انسانی زندگی اور تہذیب کے فروغ کا ذریعہ ہیں، ان کا دروازہ کھلا رہنا چاہیے، لیکن نہ آپ ظلم و جبر اور طاقت سے اپنے نظریات اور تصورات دوسروں پر مسلط کریں اور نہ کسی کو اجازت دیں کہ وہ آپ کی معاشی و عسکری کمزوری سے فائدہ اٹھا کر محض اپنی قوت اور طاقت کا سہارا لے کر آپ کے عقائد، آپ کی اقدار، آپ کے اخلاق، آپ کے نظام زندگی، آپ کے رہن سہن اور آپ کی تہذیب و تمدن پر مسلط ہو جائے'' (۶۴)

نبی کریم ﷺ کی بعثت اقوام عالم کو ایک دوسرے کے قریب آنے اور ان کے درمیان قیام وحدت کا تقاضا کرتی ہے، بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی:

> ''کسی شخص کو دنیا کا لیڈر کہنے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ اس نے کسی خاص قوم یا نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لئے کام کیا ہو..... ساری قوموں کے انسان کسی شخص کو اپنا لیڈر صرف اسی صورت میں مان سکتے ہیں، جبکہ اس کی نگاہ میں سب قومیں اور سب آدمی یکساں ہوں، وہ سب کا یکساں خیر خواہ ہو، یہ وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر ہم محمد ﷺ کو سرور عالم یا سارے جہاں کا لیڈر کہتے ہیں، ان کا یہ کام کسی خاص قوم کے لئے نہ تھا، تمام انسانوں کے لئے تھا'' (۶۵)

اقوام عالم اور مشرق و مغرب کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے کو صحیح نقطہ نظر سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی، سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> ''صدیوں سے مشرق و مغرب کا یہی انداز ہے، دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اگر سمجھا بھی تو ان سطحی اور ناقص

معلومات کی روشنی میں، جو صرف ان کے کمزور پہلو پر مبنی تھے، ان کے اندر جو خوبیاں ہیں، طاقت اور روشنی کے جو چشمے ہیں، ان سے اکثر غفلت برتی گئی، ایک نے دوسرے کو جب دیکھا تو شک، خوف اور بدگمانی کی نگاہ سے دیکھا یا پھر نفرت و ناپسندیدگی کی نگاہ سے" (٦٦)

وہ مزید لکھتے ہیں:

"انسانیت کی مصیبت مغرب کے مشرق سے جدا ہونے میں ہے، علم کو ایمان سے علیحدہ کر دینے میں ہے، کارخانوں کے صحیح مقاصد اور بہتر ارادوں کے تہی مایہ ہونے میں ہے، اس علیحدگی اور دوری نے ہمارے تمدن کو ہر طرح کے مصائب میں مبتلا کر دیا ہے، مشرق میں ایمان بڑھتا اور پروان چڑھتا رہا، مغرب میں سائنس بڑھتا اور پروان چڑھتا رہا، ایمان کو علم کی رفاقت کی ضرورت ہے اور علم کو ایمان کی سرپرستی اور نگرانی کی حاجت اور انسانیت ان دونوں کی رفاقت اور تعاون کی طالب اور منتظر ہے کہ ایک نئی سوسائٹی کی تعمیر ہو، نئی نسل تخلیق پائے، امن عالم اور سلامتی کی توقع اس قران السعدین کے بعد ہی کی جاسکتی ہے۔" (٦٧)

اس وقت مسلمانوں کو جو حالات درپیش ہیں، اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ ڈائیلاگ اور مفاہمت کی پالیسی اختیار کریں، کیونکہ اس وقت مسلمان ایمانی، اخلاقی، سیاسی، مالی، تعلیمی اور دفاعی، غرض ہر لحاظ سے دوسری قوموں، تہذیبوں خصوصاً مغرب سے پیچھے ہیں، مزید یہ کہ وہ منتشر ہیں، چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہیں اور ان میں اتحاد نہیں، اس لئے موجودہ حالات میں عقل و حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمانوں کو دوسرے اہل مذہب کے ساتھ مکالمہ اور مفاہمت کی پالیسی پر عمل کرنا چاہیے۔ اور یہ مکالمہ امن و انصاف، انسانی احترام و وقار، تنازعات کے حل، ممکنہ خطرات کے تدارک، معاشی خوشحالی، جیسے مقاصد کے لئے ہونی چاہئے، یہی چیز آج کی ضرورت ہے، اور یہ مکالمہ اہل علم اور اہل دانش کے درمیان ہونا چاہئے۔

بین المذاہب عالمی اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لئے مختصراً درج ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ مختلف مذاہب کے درمیان اتحاد پیدا کرنے اور اسلام کے پیغام کو عام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے ایک اہم اصول ''تالیف قلب'' پر عمل کیا جائے۔

۲۔ عصر حاضر میں پرامن حالات کا قیام نہایت ضروری ہے، کیونکہ پرامن حالات ہمیشہ مفاہمت بین المذاہب اور اسلامی دعوت کے لئے انتہائی مددگار ہوتے ہیں۔

۳۔ بین المذاہب عالمی اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان اختلاط پیدا کیا جائے، کیونکہ معتدل حالات میں یہ اختلاط ہمیشہ اسلام کی اشاعت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

۴۔ مفاہمت بین المذاہب پیدا کرنے اور نیز غیر مسلم اقوام کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ عالم انسانیت کا خیر خواہ بننا چاہئے، کیونکہ دین اسلام خیر خواہی ہی کا نام ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) ڈاکٹر عبدالحق انصاری، قومی یکجہتی اور اتحاد مذاہب، ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ، مجلس دارالمصنفین، ج ۱۰۲: ش ۴، اکتوبر ۱۹۶۸ء ص ۲۶۴۔۲۶۸۔

(۲) الحجرات، ۱۳:۴۹

(۳) سورۃالروم، ۲۲:۳۰۔

(٤) سنن ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیرسورت الحجرات۔

(٥) محمد بن سلیمان الفاسی، جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد، کتاب المناسك، باب التکبیر فی ایام التشریق.....

(٦) الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الادب، باب ما ینتهی عن التحاسد والتدابر۔

(۷) رواه البیهقی فی شعب الایمان بحواله مشکوٰة المصابیح للخطیب التبریزی، کتاب الادب، باب الشفقة والرحمة علی الخلق۔

(۸) الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الانبیاءؑ، باب قول اللّٰہ عز وجل واذکر فی الکتاب مریم اذنتبذت من اھلھا.....

(۹) الشوریٰ، ۱۳:۴۲

(۱۰) محمد سعید رمضان البوطی، دروس سیرت، ترجمہ فقہ السیرۃ النبویۃ، مترجم، محمد رضی الاسلام، لاھور، نشریات، ۲۰۰۷ء، ص، ۶۷، ۶۸۔

(۱۱) احبار، ۲:۲۴/۱۷، خروج، ۲۱/۲۲، گنتی، ۳۱/۳۵، استثناء ۱۱/۱۲، ۱۹

(۱۲) متی، ۵:۳۸۔

(۱۳) آل عمران، ۳: ۵۰

(۱۴) دروس سیرت، ص ۶۸

(۱۵) آل عمران، ۳:۱۹

(۱۶) آل عمران، ۳:۸۵

(۱۷) یونس، ۱۰: ۷۲

(۱۸) البقرہ، ۲:۱۳۱

(۱۹) البقرہ، ۲: ۱۳۲

(۲۰) النّمل، ۲۷:۳۱

(۲۱) ڈاکٹر یوسف قرضاوی، فتاویٰ (اردو) لاھور، دارالنوادر، ۲۰۰۵، ۱:۹۵

(۲۲) النحل، ۱۶:۱۲۳

(۲۳) ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی، مکی اسلام کی تفہیم، مسائل وجہات، السیرۃ عالمی، ش۱۵: اپریل ۲۰۰۶ء، ص ۸۶۔

(۲۴) آل عمران، ۳:۶۴

(۲۵) ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی، السیرۃ عالمی، ص ۸۸۔

(۲۶) حجة الله البالغه، کراچی، قدیمی کتب خانه، باب ۸۳، بیان ما کان علیه حال اهل الجاهلية فاصلحه النبی ﷺ، ۱: ۲۸٤، ۲۸٥۔

(۲۷) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو! ۱:۲۸۴_۲۹۳

(۲۸) ایضاً، ص ۲۹۱۔۲۹۲

(۲۹) الحج، ۲۲:۷۸

(۳۰) تکمله فتح القدير لابن الهمام، کتاب المضاربة، ۷:٤۱٥۔

(۳۱) قاضی ظہور الحسن ناظم، تاریخ الفقہ، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۷۴ء، ص ۱۶۲_۱۶۶

(۳۲) آل عمران ۳:٦٤

(۳۳) محمد عاشق الٰہی، انوار البیان فی کشف اسرار القرآن، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ۱۹۹۷ء، ۲:۷۸

(۳۴) پیر کرم شاہ الازہری، تفسیر ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ۱:۲۳۹، ۲۴۰

(۳۵) ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبدالله، احکام القرآن، بیروت، دار المعرفة، ۱۹۷۲ء ۱:۲٤

(۳۶) ظفر احمد عثمانی، احکام القرآن، کراچی، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، ۱:۳۰

(۳۷) سورة الانعام، ٦: ۹۰

(۳۸) قاضی ثناء الله پانی پتی، التفسير المظهری، دهلی، دائره اشاعت العلوم لندوة المصنفين، ۳:۲۹۸۔

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:

حسن احمد خطیب، فقہ الاسلام، (اردو ترجمہ، مترجم سید رشید احمد) کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۲، ص ۲۶۳۔

ابن العربی، احکام القرآن، ۱:۲٤۔

ظفر احمد عثمانی، احکام القرآن، ۱:۳۰۔

محمد انور بدخشانی، تیسیر اصول الفقہ، کراچی، بیت العلم، ۱۴۱۶ھ، ص:۱۶۲۔

عبد الکریم، الوجیز فی اصول الفقه، بیروت، مؤسسة الرسالة، ۱۹۸۷ء، ۲۶۳۔۲۶۵

(۳۹) الطبقات الکبریٰ لابن سعد، داراحیا التراث العربی، ۱۹۸۵ء ۶۶:۲

(۴۰) محمد ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، لاہور، مکتبہ عثمانیہ، ۱۹۸۵ء، ۲:۳۱۳، ۳۱۴۔

(۴۱) سنن ترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة۔

(۴۲) دروس سیرت، ۱: ۴۰۳، ۴۰۴۔

(۴۳) ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ۱۹۸۱ء، ص ۱۸، ۱۹۔

(۴۴) ایضاً، ص ۲۳۹، ۲۴۰

(۴۵) محمد اسد، طوفان سے ساحل تک، ترجمہ Road to Mecca، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ۱۷۳، ۱۷۴۔

(۴۶) اسلامی ممالک میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش، ص ۳۱۱، ۳۱۲

(۴۷) ابی الفداء اسمٰعیل ابن کثیر، السیرة النبویة، مطبعة عیسی البابی، ۱۹۶۴، ۱:۲۵۸

(۴۸) صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب اثم من عاهد ثم غدر۔

(۴۹) سنن ابی داود، کتاب الجهاد، باب فی دعاء المشرکین

(۵۰) اکبر شاہ خان نجیب آبادی، تاریخ اسلام، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء، ۱:۴۳۴

(۵۱) البقرہ، ۲:۲۵۶

(۵۲) آل عمران، ۳: ۶۴

(۵۳) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خطبات بہاولپور، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۹۲ء، ص ۲۳۶۔

(٥٤) (Muhammad a Biography of the propht /Karen Armstrong) Pp155 بحوالہ ششماہی "السیرۃ" عالمی، ش١٧، مارچ ٢٠٠٧ء ص، ٣٢٧

(٥٥) التوبة، ٩:٦٠

(٥٦) مولانا مفتی محمود، تفسیر محمود، مفتی محمود اکیڈمی، ٢٠٠٧ء، ١:٢٩٠

(٥٧) القرطبی، ابی عبداللہ، محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، قاهره، دارالکاتب العربی، ١٩٦٧ء ٢:٢٧٥.

(٥٨) ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی، فقه السیرة، ص ٥٤٥

(٥٩) ابن کثیر، حافظ عمادالدین، السیرة النبویة، ٣:٣٢٤

(٦٠) سید حسین احمد مدنی، مکتوبات شیخ الاسلام، گوجرانوالہ، مدنی کتب خانہ، مکتوب نمبر ٦٣، ١:١٧٤، ١٧٥۔

(٦١) شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ﷺ، کراچی، دارالاشاعت، ١٩٨٥ء، ١:٢٦٦

(٦٢) النحل، ١٦:١٢٥۔

(٦٣) البقرہ، ٢:٢٥٦

(٦٤) پروفیسر خورشید احمد، تہذیبی تصادم یا بقائے باہمی، مرتبہ، ڈاکٹر محمد ممتاز علی، لاہور، منشورات منصورہ، ٢٠٠٦ء، ص ١٠٦، ١٠٧

(٦٥) سید ابوالاعلیٰ مودودی، سیرت سرور عالم، لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، طبع ہفتم، ١٩٩٩ء، ١:١٥٧۔١٦٠

(٦٦) ابوالحسن علی ندوی، مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ص ١٤

(٦٧) ایضاً، ص، ٣١۔